کمال سنانیری شہیدؒ

شخصیت و کردار

جناب خلیل احمد الحامدی صاحب

کمال سنانیری رحمۃ اللہ علیہ سے راقم کی پہلی ملاقات ۱۹۷۲ء میں کویت میں کویت کی وزارتِ اوقاف کے شعبۂ امورِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر استاد عبداللہ عقیل کی دیوانیہ[1] میں ہوئی۔ موصوف رہائی کے بعد پہلی مرتبہ قاہرہ سے کویت آئے تھے۔ دیوانیہ میں انہوں نے اخوان المسلمون کی دعوت اور کردار کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر کا انداز ایسا عاجزانہ تھا کہ کہیں اُس میں خودستائی و خودنمائی نہ تھی۔ اور خاص طور پر انہوں نے جیل میں دی جانے والی اذیت و تعذیب کا اشارۃً بھی ذکر نہ کیا، حالانکہ حاضرین کو سب سے زیادہ جو بات معلوم کرنے کی خواہش تھی، وہ اُن کی جیل کی زندگی تھی۔ انہوں نے یہ کہہ کر اپنی بیس سالہ جیل کی زندگی کو تقریر سے خارج کر دیا کہ "جیل میں ہم نے جو وقت گزارا اور جس انداز میں گزارا وہ صرف اللہ کے لیے تھا۔ اور ہم اللہ تعالیٰ ہی سے اس کے اجر کے طلب گار ہیں۔" البتہ وہ اپنے رفقاء کے عمومی کردار، عزیمت اور صبر و جگرداری کی ستائش کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ اخوان المسلمون کے وہ تمام افراد جو سالوں تک جیل میں رہے ہیں اور گوناگوں آزمائشوں میں ڈالے جاتے رہے ہیں، وہ یہ

---

[1] کویت میں وہاں کے اکثر اہلِ علم و اہلِ وجاہت لوگ اپنے گھروں میں ایک وسیع کمرہ بنا لیتے ہیں، اُسے دیوانیہ کہتے ہیں جیسے پنجاب میں بیٹھک۔ کویت کی یہ دیوانیات زندگی اور زندہ دلی کا مرقع ہوتی ہیں۔ ہفتہ وار اُن میں مجلسیں ہوتی ہیں۔ زندگی کے تمام معاشرتی اور سیاسی مسائل وہاں زیرِ بحث آتے رہتے ہیں۔ یہ دیوانیات کویتی معاشرے پر غیر معمولی حد تک اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔

سمجھتے ہیں کہ اُن پر جو کچھ بیتی ہے، وہ مِحنَۃ (آزمائش و ابتلاء) نہیں ہے بلکہ مِنحَۃ (انعام و عطیہ) ہے۔ کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں اُن کے ذاتی کردار کو مضبوط اور جماعتی وقار میں اضافہ کر دیا ہے اور آخرت میں انہیں خوشنودیٔ رب کے حصول کا یقین ہے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد پھر بارہا کمال شہید سے ملاقاتیں ہوئیں۔ پاکستان بھی وہ تین بار تشریف لائے اور آخری مرتبہ تو وہ تقریباً ڈیڑھ ماہ پاکستان میں رہے۔ وہ لاہور اور پشاور جہاں جہاں رہے دوستوں اور ملنے والوں کے دلوں میں اپنی حسین یادوں کے انبار چھوڑ گئے۔ اُن کی مثال گُلِ خوش رنگ کی تھی۔ وہ خود کانٹوں کے درمیان جی رہے تھے۔ مگر دوسروں کے لیے وہ سراسر لطف و انکساری اور سراسر خوشبو تھے۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ وہ کون سنگدل جلاد ہو گا جس نے کمال جیسے شریف، درویش صفت اور پیکرِ صدق و صفا انسان پر ہاتھ اُٹھایا ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ جس جلاد نے کمال کا گلا دبوچا ہو گا (کمال کے اہلِ خانہ نے بتایا ہے کہ جب لاش اُن کے سپرد کی گئی تو اُن کی گردن پر سیاہ لکیر تھی) کمال اُسے نادمِ واپسیں یہی کہتے رہے ہوں گے کہ "ظالم خدا تجھے معاف کرے"۔ کیونکہ کمال کا مزاج جذبۂ انتقام سے خالی اور زبان درشت کلامی سے ناآشنا تھی۔

راقم نے ہمیشہ کمال کو یہ دُعا سِرّاً اور جہراً کرتے سنا کہ: "اے اللہ میری موت تیرے راستے میں شہادت کی موت ہو"۔ وہ یہ دُعا بڑے جذب و شوق اور اخلاص و انہماک سے مانگا کرتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس روزِ سعید کا بڑی بے تابی و اضطراب کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ خدا کے دربار میں جامۂ شہادت پہنے حاضر ہوں۔ وہ اپنے ساتھی شہیدوں (عبدالقادر عودہ سید قطب اور عبدالفتاح اسماعیل وغیرہم) کا بڑے رشک و ولولے سے ذکر کیا کرتے تھے۔ ان کی گرمیٔ رشک بتا رہی ہوتی تھی کہ اُن کی روح اُن کے ساتھی شہدا کی روحوں سے بڑی ہم آہنگ ہو چکی ہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے کمال کی دُعا قبول فرمائی اور ۱۳ محرم ۱۴۰۲ھ کو موصوف مصری جلادوں کے ظالمانہ تعذیب و تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ ایک طرف وہ قافلۂ شہداء میں شامل ہو کر جریدۂ عالم پر اپنا نقشِ دوام ثبت کر گئے اور دوسری طرف وہ ان بے رحم اور بدبخت ظالموں کے لیے دائمی لعنت و رسوائی کا داغ چھوڑ گئے جنہوں نے ۶۳ سال کے اس ولی و خدا پرست انسان کو جیل کے اندر بے بسی کی حالت میں اپنی درندگی و بہیمیت کا نشانہ بنایا۔

کمال سنانیری ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے۔ وہ حسن البنا رحمۃ اللہ علیہ سے ۱۲ سال چھوٹے تھے۔
اخوان المسلمون کی تاسیس کے وقت ان کی عمر ۹ سال تھی۔ دارالعلوم قاہرہ میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل
کی۔ اقتصادیات اُن کا مضمون تھا۔ جس زمانے میں وہ دارالعلوم قاہرہ کے طالب علم تھے۔ نہ صرف
دارالعلوم قاہرہ بلکہ مصر کے تمام تعلیمی ادارے اخوان المسلمون کی دعوت سے اثر پذیر ہو رہے تھے۔
اخوان المسلمون کی تحریک کو جو بھی قابل ذکر اور قابلِ قدر کارکن ملے وہ تعلیمی اداروں ہی سے ملے۔ دینی
تعلیم کی درسگاہوں کی نسبت جدید تعلیم کی درس گاہیں اخوان کی دعوت کو زیادہ شوق و ذوق سے قبول
کر رہی تھیں۔ کمال ۱۹۴۲ء میں باقاعدہ تحریک شامل ہوئے۔ اس وقت اُن کی عمر ۲۳ سال تھی۔ وہ
فطرتاً باصلاحیت اور نیک منش تھے۔ اس پر مستزاد گھر یلو تربیت تھی۔ وہ مصر کے ایک دیہاتی خاندان
کے چشم و چراغ تھے۔ اور اس بنا پر وہ سادگی، اخلاص اور وفا شعاری کی اُن تمام خوبیوں سے آراستہ
تھے، جو مصری فلاحین اور مصر کے دیہی معاشرے کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ اخوان المسلمون کی تحریک میں
جب انہوں نے اپنے عنفوان شباب میں شمولیت کی تو پہلے ہی روز سے انہوں نے اپنی زندگی کا راستہ
بدل لیا۔ اب وہ اصلاً تحریک و دعوت کے لیے تھے۔ اور بعد میں کسی اور پہلو کے لیے بے داغ جوانی
کے ساتھ انہوں نے راہ حق میں قدم رکھا۔ اور پھر اپنی جوانی اور جوانی کے تمام ولولے اور امنگیں
قربان کرتے ہوئے اپنے آپ کو اسی طرح تحریک کا جزو لاینفک بنا دیا جس طرح قطرہ سمندر میں گر
کر جزو سمندر بن جاتا ہے۔

کمال شہید کی تحریکی زندگی ۴۰ سال پر مشتمل ہے۔ ان چالیس سالوں میں سے ۲۰ سال انہوں نے
جیل کی سلاخوں میں گزارے۔ اور ۲۰ سال جیل کے باہر جد و جہد اور دعوت و تبلیغ میں۔ وہ
۱۹۴۱ء میں تحریک میں داخل ہوئے اور پھر ۱۹۵۴ء میں وہ جمال عبدالناصر کے عہدِ نامسعود میں دوسرے
ساتھیوں کے ساتھ جیل میں ڈال دیے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انہیں رہا ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ رہائی کی
گھڑیاں گن رہے تھے کہ انہیں جیل میں یہ نئے احکام مل گئے کہ انہیں مزید دس سال کے لیے قید بامشقت
دی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ دورانِ گفتگو راقم نے کمال شہید سے پوچھا کہ جب آپ کو گیارہ سال قید گزارنے
کے بعد رہائی کی تیاری کے دوران یہ خبر ملی کہ دس سال مزید جیل کی کوٹھڑی گزارنے ہوں گے تو آپ کا
کیا تاثر تھا؟" فرمانے لگے کہ ذہنی اور نفسیاتی طور پر ہماری یہ حالت ہو گئی تھی کہ نہ رہائی کے لیے

ہمارے اندر کوئی بے چینی تھی اور نہ مزید قید پر ہمیں کوئی ملال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے دلوں کے اندر اطمینان وسکینت کا اس قدر نشہ پیدا کر رکھا تھا کہ ہم قید اور رہائی دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہ محسوس کرتے تھے"۔

بہرحال ۱۹۷۲ء میں انور سادات کے دور میں جب حالات میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی اور مصری عدلیہ کو قدرے آزادی کی فضا فراہم ہوئی تو اخوان قیدیوں کے ورثا نے عدالتوں میں درخواستیں دائر کرنا شروع کر دیں اور ان کے نتیجے میں اخوان قیدی رہا ہونا شروع ہوئے۔ ان میں کمال شہید بھی تھے۔

اخوان المسلمون کا طویل دَورِ ابتلاء (۱۹۵۴ء تا ۱۹۷۲ء) مصری تاریخ کا ایک اہم دَور ہے۔ انور سادات کے عہدِ حکمرانی میں اس دَور کے سیاہ اوراق کافی حد تک طشت از بام ہو چکے ہیں۔ اور یہ کوئی اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی کہ اس دَور میں کس طرح قانون کی مٹی پلید کی گئی، اور کس قدر لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو لوٹا گیا، کس طرح ہر انسانی قدر اور ہر شریف پیکر کو پامال کیا گیا۔ اخوان کی قیادت کا ایک حصہ (عبدالقادر عودہ، یوسف طلعت، شیخ محمد فرغلی، ابراہیم الطیب، ہنداوی دویر) ۱۹۵۴ء کو نذرِ دار ورسن کر دیا گیا تھا۔ اور باقی ماندہ حصہ (سید قطب، یوسف ہواش، عبدالفتاح اسماعیل) ۱۹۶۵ء میں ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں جب اخوان المسلمون کی رہائی ہوئی تو مصر کے اندر اخوان کے صرف وہ لوگ رہ گئے تھے جو صفِ دوم کے لوگ تھے، لیکن اپنے اعلیٰ کردار، مضبوط سیرت اور تقویٰ و للہیت کی بدولت اب وہی قیادت کے منصب پر فائز ہوئے۔ ان حضرات میں جناب عمر تلمسانی، کمال سنانیری، مصطفیٰ مشہور، صلاح شادی، احمد حسن اور محمود عبدالحلیم سرِفہرست ہیں۔ جناب عمر تلمسانی اخوان کے غیر رسمی[1] مرشدِ عام (سربراہ) ہیں۔ اور کمال سنانیری اور ان کے بعض اور ساتھی نائب مرشدِ عام اور دیگر ذمہ دارانہ مناصب پر فائز ہوئے۔ کمال سنانیری تو خدا کو پیارے ہو گئے ہیں۔ اور باقی قیادت ایک آدھ فرد کو چھوڑ کر، پھر جیل میں ڈال دی گئی ہے۔ ——— لطف کی بات یہ ہے کہ

---

[1] "غیر رسمی" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اخوان المسلمون کو آج تک مصر میں قانوناً بحال نہیں کیا گیا ہے۔ ابھی تک یہ تحریک خلافِ قانون ہے۔ اس لیے اخوان کے لوگ اپنی باقاعدہ تنظیم نہیں کر سکے اور نہ مختلف مناصب اور ذمہ داریوں کو سنبھالنے والوں کا رسماً اعلان کر سکے ہیں۔

یہ حضرات انور السادات کے قتل سے بہت پہلے جیل میں ڈال دیے گئے۔ اور ان پر الزام یہ تھا کہ مسلمانوں اور قبطیوں کے مابین اسیوط میں اور مصر کی نواحی بستی الزاویۃ الحمراء میں جو فسادات ہوئے ہیں، ان میں اخوان کا ہاتھ ہے۔ یہ الزام سراسر بے بنیاد تھا۔ اور خود حکومت اور عوام دونوں جانتے تھے کہ یہ الزام بلا سبب اخوان کے سر منڈھ دیا گیا ہے۔ اصل قصہ کچھ اور ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کو پہلے تو مصری قوم نے پروپیگنڈے کے طوفان میں قبول کر لیا۔ مگر جب رفتہ رفتہ اس کے اسرار کھلتے گئے اور یہودیوں کی چالبازی نمایاں ہوتی گئی تو مصری عوام کے اندر اس سمجھوتے کے خلاف فضا پیدا ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اخوان نے پہلے ہی روز اس سمجھوتے کو مسترد کر دیا تھا۔ اور پھر اخوان کی ہمنوائی میں مصر کے دینی حلقوں اور نوجوانوں کی اسلامی تنظیموں نے بھی اس پر شدید تنقید شروع کر دی۔ اور بات اس حد تک بڑھ گئی کہ مصر کی ہر مسجد و منبر سے کیمپ ڈیوڈ کے خلاف آواز بلند ہو گئی۔ یہ صورت حال دیکھ کر اسرائیلی لیڈروں نے سادات کو تنبیہ کر دیا کہ اگر یونہی مصر میں اخوان المسلمون اور دیگر اسلامی جماعتیں اور مذہبی حلقے اسرائیل کے خلاف عوام کو بھڑکاتے رہے تو اسرائیل ہرگز سینا کو خالی نہیں کرے گا۔ یہ گویا اسرائیل کی طرف سے سادات کو یک گونہ دھمکی تھی۔ سادات یہ دھمکی سن کر اعصابی کیفیت میں مبتلا ہو گیا۔ اور اس ہسٹیریائی حالت میں اس نے اخوان اور اسلامی جماعتوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اخوان کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ "لن ارحم" (میں ان پر ہرگز نہیں رحم کھاؤں گا) اور مصر کے ایک ہر دلعزیز خطیب شیخ محمد المحلاوی کو جیل میں ڈال کر کہا کہ "میں نے ایک کتے کو جیل میں ڈال دیا ہے۔" (استغفر اللہ)

اسی پکڑ دھکڑ میں جناب عمر تلمسانی، کمال سنانیری اور دیگر زعمائے اخوان بھی گرفتار کر لیے گئے۔ حسنی مبارک سے یہ توقع تھی کہ وہ پیشرو کی غلطیوں کی اصلاح کریں گے۔ لیکن انہوں نے تا حال یہ عزم کر رکھا ہے کہ وہ سادات کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سادات کے جاری کردہ مشن کو مکمل کریں گے۔ حسنی مبارک کے دور میں ہی یہ نامبارک واقعہ پیش آیا ہے کہ کمال سنانیری جیسا اعلیٰ پائے کا متوازن مزاج اور فرشتہ خصلت انسان جیل میں شہید کر دیا گیا۔ اس بے گناہ خون کا نتیجہ حسنی مبارک صاحب کے حق میں کیا برآمد ہوگا اس کا جواب مستقبل دے گا۔

امام حسن البناء رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ تحریک کے مثالی کارکن کے اوصاف بیان کرتے ہوئے

فرمایا تھا کہ اس میں تین خصلتوں کی جھلک ملنی چاہیے: ۱۔ دمعة المتهجد (تہجد گزار کے آنسو)۔ ۲۔ تباهد الفقيه (فقیہ کی ذہانت)، ۳۔ شجاعة المقاتل (جنگ جو کی بہادری)۔ تعلق باللہ کا سب سے بڑا ثبوت وہ بے ریا اشک ہیں جو رات کی تنہائیوں میں خدا پرست انسان کی آنکھوں سے ٹپکتے ہیں۔ دین کی صحیح خدمت فہم و شعور اور حکمت و دانش کے سرمائے کے بغیر انجام نہیں دی جاسکتی۔ راہِ حق کی دشوار گزار وادیوں اور طاغوتی طاقتوں کی بے پناہ ستم رانیوں کا سامنا تھڑدلے، کم حوصلہ اور تنک مزاج لوگوں کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے صبر و تصلب کا وافر ذخیرہ اور ہمت و شجاعت کا اونچا معیار درکار ہے۔ انہی تینوں محاسن کو امام حسن البناؒ نے تین جامع کلمات کے اندر سمو دیا ہے۔ امام موصوف زندگی بھر اس طرز کے کارکن تیار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام حسن البناؒ خود ان تینوں صفتوں کا بہترین امتزاج تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تربیت سے جو کارکن پیدا کیے ان میں بھی ان کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جناب کمال سنانیری بھی اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنے مُرشد کے اس معیار کے آئینہ دار تھے۔

کمال شہید کو اپنے رب سے بے پناہ محبت تھی۔ انہوں نے اپنی جان و مال اور اپنی زندگی کی ہر اُمنگ و آرزو کو بلکہ زندگی کی ہر عزیز سے عزیز تر شے کو خدا کے راستے میں بیچ دیا تھا۔ ضروریاتِ زندگی کا دائرہ انہوں نے بے حد مختصر کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا مضمون نظر آتے تھے کہ "کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل (دُنیا میں اس طرح رہو کہ گویا تم کوئی نووارد ہو یا مسافر)۔ کویت، سعودی عرب اور پاکستان میں کئی بار اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سفر میں صرف ایک یا دو پہننے کے جوڑے رکھتے تھے، اور باقی ہر ضرورت سے بے نیاز رہتے۔ یہی حال اُن کا مصر میں تھا۔ ان کے ایک رفیق مصطفےٰ مشہور بتاتے ہیں کہ قاہرہ میں کمال سنانیری کی رہائش گاہ چند برتنوں، دو تین چارپائیوں اور چند مردانہ اور زنانہ جوڑوں سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ اپنی ہر چیز تحریک کے سپرد کر چکے تھے۔ اور عیشِ کفاف کو نظریۂ حیات بنا چکے تھے۔ ان کی تمام مالی و جسمانی توانائیاں، ذہنی و فکری صلاحیتیں اور اوقات و لمحات کی فرصتیں راہ حق کے لیے وقف ہو چکی تھیں۔ اس درویشانہ زندگی اور مجاہدانہ روش اختیار کرنے میں اُن کی رفیقِ حیات بھی بڑی ممد و معاون ثابت ہوئیں (باقی بر صفحہ ۴۶)